شبیر احمد خاں

فکر و نظر کے دو زاویے

دنیا میں دو مختلف نظامہائے فکر و عمل مروج ہیں لیکن ہر نظام کی (خواہ وہ فکری و ذہنی ہو، یا عملی و معاشرتی) بنیاد کسی نہ کسی مخصوص نظریۂ کائنات پر مبنی ہوا کرتی ہے۔ اصولی طور پر کائنات کے متعلق ان مختلف نظریات کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :۔ میکانکی اور نصب العینی۔ مزید تفصیل حسب ذیل ہے :۔

انسان اور سوچ بچار (فکر) لازم و ملزوم ہیں لیکن فکر کیا ہے ؟ منتشر واقعات کائنات اور حوادث روزگار کو ایک منظم وحدت میں مرتب کرنے کا عمل پیہم۔ ہر واقعہ چھوٹا ہو یا بڑا انسان اُسے دوسرے واقعات کے ساتھ وابستہ و مربوط کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ تلاش و تجسس انسانی فطرت ہے اور وہ ہر بات کے متعلق جاننا چاہتا ہے کہ

"ایسا کیوں

یہ اضطراری سوال اس کے جواب کے لیے مسلسل ذہنی ورزش ہی فکر کی جان ہیں۔

بہر حال اس "کیوں" کے دو معنی ہیں :۔

ا۔ اس بات یا واقعہ کا سبب کیا ہے ؟

یا زیادہ نپی تلی اصطلاح میں اس کی علّت فاعلی (Efficient Cause) کیا ہے یہ سائنس کا مشغلہ ہے اور اس انداز فکر کو "کائنات کی میکانکی توجیہ" (Mechanical interpretation of the universe) کہتے ہیں۔

ب۔ کیوں کے دوسرے معنی ہیں "کس لیے یا کس غرض سے ؟"

اس معنی کہ انسان سوچتا ہے کہ فلاں بات کس غرض یا مقصد کے پیش نظر ظہور میں آئی - یا اصطلاحی زبان میں اس کی غایت یا علّت غائی (Final Cause) کیا ہے - یہ حکمت و فلسفہ کا وظیفہ ہے اور اس انداز فکر کو "کائناتی نصب العینیت" یا "کائنات کی نصب العینی توجیہ" (Teleological interpretation of the universe) کہتے ہیں-

(۱) میکانکی توجیہ کائنات

کائنات کی میکانکی توجیہ کی رو سے تمام حوادث کائنات بشمول انسانی افعال کے ایک لامتناہی سلسلہ علل و معلولات کے ناقابل شکست جال میں جکڑے ہوئے ہیں - اور اس کے مطابق دنیا کی ہر شے حتیٰ کہ انسان بھی مادے یا فطرت (Nature) کی خود رایانہ مشیت کے بے دست و پا غلام ہیں - اس نظریہ کا کہنا ہے کہ جو کچھ انسان کر رہا ہے، وہ ان واقعات کا نتیجہ ہے جو اس سے پیشتر ظہور پذیر ہو چکے ہیں اور وہ واقعات اپنی نوبت میں دیگر واقعات کا سابقہ نتیجہ ہیں اور وہ واقعات سابقہ اپنے سے قدیم تر واقعات کا - اور اسی طرح یہ سلسلہ الاالی نہایہ چلا جاتا ہے - پس اگر ایک پتہ بھی ہلتا ہے تو اس کے اسباب لامتناہی زمانہ پہلے وجود میں آ چکے تھے اور اس بات کے مقتضی تھے کہ یہ پتہ اسی مقررہ وقت پر ہلے - لہٰذا حریت عمل بے معنی ہے ؎

ساقیا مے دہ کہ با حکم ازل تدبیر نیست　　قابل تغییر نبود آنچہ تعیین کردہ اند

میکانکی انداز فکر کی دو شکلیں

چونکہ اس انداز فکر میں زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے "آدمی بلبلہ ہے پانی کا"، جو بغیر کسی مقصد کے یونہی سطح آب پر نمودار ہو گیا - چند لمحے رہا اور پھر اسی طرح نابود ہو گیا - اس لئے اس انداز فکر کے طبیعت میں راسخ ہو جانے کے بعد عملی زندگی پر جو اثرات مترتب ہوتے، وہ دو میں سے ایک شکل اختیار کر لیتے ہیں: رہبانیت یا دہریت -

قدیم میکانکیت اور رہبانیت

جب واقعات حاضرہ علل ماضیہ کے تابع ہیں، جو ہمارے حیطۂ اقتدار سے باہر ہیں تو ہماری سعی و کوشش بیکار ہے۔ ہم واقعات کا رُخ نہیں موڑ سکتے۔ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ اپنی فلاح و بہبود کے بنانے بگاڑنے میں ہماری ذاتی کوشش بے کار ہے ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ خیال طبیعت میں راسخ ہو کر بدترین یاس، قنوطیت اور تشاؤم پیدا کر دیتا ہے۔ ہمارے حوصلے پژمردہ اور قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں عمل پر بے عملی کو ترجیح دیتے ہیں۔ شادی و غم، گوارا و ناگوار اور خوب و ناخوب بے معنیٰ لفظ بن جاتے ہیں۔ انسانی زندگی حباب بر سطح آب معلوم ہوتی ہے کہ پیدا ہوا اور ناپید ہو گیا۔ اور اس طرح ناپید ہوا کہ نہ اس کا نشان باقی رہتا ہے اور نہ اس کے بازگشت کی کوئی امید۔

تو پھر یہ تگ و دو کس لیے؟ زندگی اور اس کے تمام مشاغل بیش از بازیچۂ اطفال نہیں۔ دنیا ایک طلسم رنگ و بُو ہے، ایک نمود بے بود ہے، ایک منظر سیمیائی ہے۔ بڑا نادان ہے، جو اس نمود سیمیا کا فریب کھائے اور اس بازیچۂ اطفال میں اپنی زندگی گنوائے۔ مردِ عاقل وہی ہے جو دنیا اور دنیا کی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو جائے اور اس کے کسی معاملے میں حصہ نہ لے۔

اس طرح اس تصوّر کائنات کا نتیجہ (جو میکانکی نقطۂ نظر ہی کی ایک سلبی و منفی شکل ہے) اپنے متبعین کے حق میں فرار عن الحیات، ترک دنیا اور رہبانیت اور ویراگ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے تصوّر کائنات کے اس فارق المرکز عقیدے سے کسی صالح اور تنومند سماج کی تنظیم نہیں ہو سکتی۔ اس کے آگے کوئی ایجابی پروگرام نہیں ہے۔ صرف ایک سلبی لائحہ عمل ہے جس کے ہر ہر جزء میں ایک منفی کیفیت اور زندگی کی سنجیدہ حقیقتوں سے نظریں چرانے اور کترا کر نکل جانے کی ایک مشترک خصوصیت پائی جاتی ہے۔

جدید میکانکیت اور دہریت

یہی میکانکی اندازِ فکر کہیں انانیت، خود غرضی، لذت پرستی، عیش کوشی اور دہریت کو اختیار کر کے "دنیا طلبی" ہی کو زندگی کی قدرِ اعلیٰ قرار دیتا ہے۔ یہ دنیا طلبی قدیم زمانہ میں "دہریت" کہلاتی تھی اور عہدِ حاضر میں "مادیت"۔ مگر قدیم دہریت ہو یا جدید مادیت مترفین روزگار کا بڑا عقیدہ رہے ہیں۔ ایران قدیم میں اس کے پیرو زروانی یا دہری کہلاتے تھے، چنانچہ "اسکندگانیک وثار" میں جو ساسانی حکومت کے زوال کے قریب کی تصنیف ہے لکھا ہے:۔

"جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا نہیں ہے اور اپنے آپ کو دہری کہتے ہیں اس بات کے قائل ہیں کہ کوئی مذہبی فرض انسان کے ذمہ نہیں ہے اور نہ کوئی نیک عمل اس پر واجب ہے۔ لایعنی باتیں جو وہ بکثرت کرتے رہتے ہیں، ان کی مثال یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ دنیا اور وہ تمام تغیرات جو اس میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور ترتیب اجسام اور وسائل عمل اور اشیاء کا باہمی ربط و تضاد وغیرہ یہ سب زمان نامحدود کے ارتقاء کے نتیجے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ نہ اچھے اعمال کے لئے جزا ہے اور نہ برے اعمال کے لئے سزا۔ نہ بہشت ہے نہ دوزخ اور نہ کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کو اچھے یا برے کاموں پر مجبور کر سکے۔" [۱]

عرب جاہلیت میں یہ لوگ "معطلہ" کہلاتے تھے، چنانچہ شہرستانی نے "کتاب الملل والنحل" (جزء ثانی صفحہ ۹۶) میں لکھا ہے:۔

> "جاننا چاہیئے کہ عرب (جاہلیۃ) کے مختلف فرقے تھے بعض لوگ اُن میں سے مذہب تعطیل کے پیرو تھے۔ ان کا ایک فرقہ خالق کائنات اور حشر و نشر کا منکر تھا اور اس بات کا قائل تھا کہ طبیعت زندگی بخشنے والی ہے اور دہر فنا کرنے والا ہے۔ اور اسی فرقے کے قول کو قرآن حکیم دہراتا ہے۔ قالوا وما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت

---

[۱] ایران بعہد ساسانیاں از کرسٹن سین صفحہ ۵۸۵ - ۵۸۶

ونحییٰ وما یھلکنا الا الدھر۔ جس کا اشارہ طبائع محسوسہ کی جانب ہے، نیز اس بات کی طرف کہ زندگی اور موت انہیں طبائع کی ترکیب و انحلال پر موقوف ہے۔ پس طبیعت جامع ہے اور دہر مہلک"۔

عہدِ حاضر میں یہ مذہب "مادیت" کے نام سے موسوم ہے۔ اس مکتب فکر کا ہر فرو زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، بلا لحاظ اس امر کے کہ جو طریق کار وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرتا ہے، جائز ہے یا ناجائز کیونکہ ایسے ماحول میں جائز و ناجائز بے معنی ڈھکوسلے ہیں۔ اس نظام میں طاقت ہی حق ہے خواہ مادی ہو یا ذہنی۔ لہذا انسانی برادری میں بہائم سیرتی اور درندہ صفتی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے، کہیں چھپی ڈھکی اور کہیں علی الاعلان کھلی ہوئی اس طرح انسانی سماج، طبقاتی کشمکش کی ایک دائمی سٹیز گاہ بن جاتا ہے۔

ایسے نام نہاد سماج کے نظم و تنظیم کے لئے جو قانون اور ضابطے وضع کئے جاتے ہیں، ان کا بنیادی اصول محض اتنا ہوتا ہے کہ سماج کے وہ افراد، جو جسمانی یا ذہنی طور پر قوی ہیں، کمزوروں کو صرف اس لئے زندہ رہنے دیں کہ ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے اپنی دنیوی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ پورا کر سکیں۔

میکانکی کونیات

میکانکی توجیہ کائنات کی اساس "غائیت" (Teleology) کے انکار پر قائم ہے۔ عہد قدیم (قدیم یونانی فلسفہ میں اس کا سرگرم مبلغ دیمقراطیس تھا، وہ "غائیت" کا منکر تھا۔ چنانچہ ویبر "تاریخ فلسفہ" میں لکھتا ہے (صفحہ ۳۷):۔

"دیمقراطیس ہر قسم کی غائیت کا انکار کرتا ہے لیکن وہ بخت و اتفاق کا بھی منکر ہے اگرچہ وہ کبھی وجوب مطلق کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے"۔

میکانکیت کا دوسرا سرگرم مبلغ ابیقورس تھا، اس کے بارے میں ویبر لکھتا ہے:۔

"خلا، سالمات اور وزن، قصہ مختصر میکانکی علل و اسباب کائنات کی توجیہ کے لیے

کافی ہیں۔ مابعد الطبیعیات کے لیے علل غائیہ سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

بہرحال اس انداز فکر کی رُو سے حوادث کائنات مادے یا سالمات (Atoms) کے بے مقصدی مظاہر کے ظہور کی داستان ہیں جن کی نہ کوئی غرض و غایت ہے نہ کوئی مقصد و نصب العین کائنات ہو یا انسانی زندگی، اسی کور بصیرت مادّے کے بے مقصدی ارتقاء کے عارضی مظہر ہیں جو مختلف میکانکی قوتوں کے عمل و تعامل سے ظہور میں آئے ہیں اور انہیں قوتوں کے ایک بے مقصد عمل دیگر سے ختم ہو جائیں گے۔

میکانکی دینیات

لہٰذا اس نظریہ کی رُو سے نہ خدا ہے (نعوذ باللہ منہا) جسے اس کائنات کا خالق سمجھا جائے اور نہ اختتام کائنات کے بعد کوئی دوسرا عالم ہے۔ جہاں جا کر اپنے خوب و ناخوب اعمال کی جواب دہی ہو۔ اور جب آخرت ہی نہیں تو آخرت کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے الٰہی الاصل صحیفۂ ہدایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر "ایمان بالرسالت" ان لوگوں کے نزدیک ایک بے معنیٰ لفظ ہے۔

مادہ پرست لامذہب ہوتے ہیں۔ لیکن "جدلیاتی مادیت" تو مذہب کی دشمن ہے۔ چنانچہ لینن اپنی کتاب "سوشلزم اور مذہب" میں لکھتا ہے :-

"ہمارے پروپیگنڈے میں لازمی طور پر لامذہبی اور انکار خدا کی تبلیغ و اشاعت شامل ہے"

(لینن۔ سوشلزم اور مذہب، صفحہ ۱۰)

"ہمارے لیے نظریاتی جدوجہد کوئی نجی معاملہ نہیں ہے بلکہ پوری جماعت اور پورے مزدور طبقہ کا معاملہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم کیوں نہ اپنے پروگرام میں اس بات کا اعلان کر دیں کہ ہم لامذہب اور خدا کے منکر ہیں؟" (ایضاً صفحہ ۹)

میکانکی اخلاقیات

ظاہر ہے کہ اس انداز فکر کے ماتحت جو ضابطۂ عمل مرتب ہوگا وہ غایت اور مقصد کے

تصوّر سے یک قلم معرّا ہوگا اور جب کسی نظامِ فکر میں "مقصدیت" (Purposiveness) کی کوئی گنجائش نہ ہو تو اس میں شائستہ و ناشائستہ اور خوب و ناخوب کے امتیاز کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زائد از زائد یہ کہ تحفظ ذات کے نام پر جو خوش گوار اور لذت بخش ہے وہ اچھا ہے اور جو ناگوار اور تکلیف دہ ہے، وہ بُرا ہے۔ لہٰذا "میکانکیت پسند" سماج میں جو نظامِ معاشرت مرتب ہوگا، وہ خوب و ناخوب کے اسی "لذتیتی تصور" (Hedonistic conception) پر مبنی ہوگا، جس کے عنوان پر جلی قلم سے رقم ہوگا:

در عیش نقد کوش کہ چوں آبخور نماند آدم بہشت روضۂ دار السلام را

میکانکی اجتماعیات

میکانکی اندازِ فکر میں مقصدیت کے فقدان سے طبیعت میں سنجیدگی اور متانت کے بجائے ملاہی اور ملاعب کی طرف رجحان بڑھنے لگتا ہے۔ لذّت پرستی، عیش کوشی اور ابیقوریت زندگی کی اقدارِ اعلیٰ قرار پاتی ہیں۔ خود فریبی کے لئے ہم لہو و لعب اور فحاشی کو "آرٹ کی سرپرستی" کا فیشنی نام دیتے ہیں۔ معاشی زندگی میں زبان سے تو ہم منصوبہ بندی اور پلاننگ (Planning) کے دعوے کرتے ہیں۔ مگر حقیقتاً "لامقصدیت" ہمارا مقصد ہوتا ہے زندگی کی وسعتوں سے قصداً نظریں چراتے ہیں اور اپنی توجہ اس کے ایک حقیر حصّے میں چمک دمک پیدا کرنے پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ دنیوی اور اُخروی زندگیوں میں نظم و ارتباط پیدا کرنے کے بجائے اپنا وقت اور توانائی وسائلِ دولت کی پیدا کرنے پر صرف کرتے ہیں۔

میکانکی علمیات

لیکن اس اندازِ فکر کا انتہائی افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس کے پیرو اپنی خودی و خودداری اور حریتِ عمل کی متاعِ بے بہا سب کچھ کھو کر بھی معمائے کائنات کی گتھی جسے وہ سلجھانے چلے تھے، نہ سلجھا سکے۔ لامتناہی سلسلۂ علل و معلولات کے جال میں ایسے پھنسے کہ اس سے نکلنا تو درکنار جتنا اس کے سرے کی تلاش میں بڑھتے گئے، اتنا ہی کھوتے گئے اور انجام کار حیرت و سرگشتگی

کے اس بھنور میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے جس کا رخ تک متعین نہیں ہے :

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا ست   این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

میکانکیت اور تشکیک و بے اعتمادی

اس لاحاصل تفکیر وافر کا انجام تشکیک وارتیابیت کے سوا کچھ نہیں ہوتا جس کا زہر انسان کی علمی صلاحیتوں ہی کو مسموم بنانے پہ اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اس کا مذہب، اخلاق، سیاست بین الاقوامی دیانتداری سبھی کچھ اس کے سم قاتل سے ہلاک ہونے لگتے ہیں۔ اعتماد کے بجائے جو صلح معاشرتی زندگی کی شرط اولین ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں بے اعتمادی بڑھنے لگتی ہے :

اعتمادے نیست بر دورِ جہاں   بلکہ بر گردون گردان نیز ہم

کائنات کی ہر چیز اور دنیا کا ہر شخص دشمن نظر آتا ہے۔ قرون حالیہ کے وحشی کی طرح ہماری زندگی بھی خوف اور اندیشہ کی مسلسل داستان بن گئی ہے :

ایمن مشو ز عشوۂ دنیا کہ این عجوز   مکارہ می نشیند و محتالہ می رود

اس اندازِ فکر نے سب سے زیادہ جس چیز کو متاثر کیا ہے، وہ ہیں عہد حاضر کی بین الاقوامی سرگرمیاں۔ ہر ملک کو ساری دنیا اپنی دشمن نظر آتی ہے ان کے ناگہانی حملوں کے بے بنیاد اندیشوں سے خائف و ترسناک ہو کر خزانہ عامرہ کا بڑا حصہ دفاع پر خرچ کیا جا رہا ہے، اگرچہ ملک کی فاقہ کش اکثریت قحط، بھوک مری وبا اور جہالت کی شکار ہے۔

میکانکیت اور قنوطیت

میکانکی اندازِ فکر سے انجام کار طبیعت پر قنوطیت طاری ہو جانا ناگزیر ہے، اس لئے کہ جب واقعات کو ایسا ہی ہونا ہے تو ہماری سعی و کوشش بے کار ہے۔ ہم بیدرد فطرت کے ہاتھ میں بیدست و پا غلام ہیں۔ ایک ظالم (نعوذ باللہ منہا) مشیت ہے جسے ہمارے رنج و آلام پر رحم نہیں آتا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اور ہماری یہ کرب و بے چینی نیچر کی خوشی کا باعث

ہے۔ ہمارا وجود ہی رنج والم کے لئے ہے :

من از کجا و فراق از کجا و غم ز کجا مگر کہ زاد مرا مادر از برائے فراق ما

یہ قنوطیت بڑھ کر مزاج میں تشاؤم پیدا کر دیتی ہے۔ کائنات کی ہر شے ہمیں اپنی دشمن نظر آتی ہے۔ ہر طرف آلام و تکالیف ہی معلوم ہوتے ہیں ؎

سماط دہر دوں پرور ندارد شہد آلائش مذاق حرص و آز اے دل بشوی از تلخ و از شورش

یہ قنوطیت اور تشاؤم بڑھ کر مایوسی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس کے بعد نہ دل میں کوئی لگن پیدا ہوتی ہے نہ طبیعت میں اُمنگ :

مجو درستیِ عہد از جہانِ سست بنا کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

سائنس اور میکانکیت کی ناکامی کا اعتراف

میکانکی قیل وقال اور طبیعیات کی کد و کاوش کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ خود اکابر سائنس اپنی کاوشِ فکر کی افادیت سے آج مایوس ہو چکے ہیں، چنانچہ ایک محقق لکھتا ہے :۔

"آج فنی علوم کا ماحصل کیا ہے ؟ چند مساواتیں جن کی توجیہ سے خود اُن کے دریافت کنندگان قاصر ہیں اور کچھ نظریے جنہیں وہ بغیر تفلسف کے نہیں سمجھا سکتے۔ اور پھر بھی انہیں اُن کے بہت سے رفقا تسلیم نہیں کر پاتے۔ یا یوں سمجھیئے کہ آج علمائے سائنس خود اپنے اکتشافات کو نہیں سمجھ پا رہے کیونکہ وہ مبادی و اولیات جو تمام اکتشافات کے افہام و تفہیم کے لیے ضروری ہیں، خود بادر ہوا ہیں ——— وہ قدیم ڈھانچہ اور پس منظر جو اہل سائنس کے تخیل و تصویر کائنات کا قوام تھا، خود سائنس کے لئے خطرہ ہے کہ خود اپنے ہی اکتشافات و ایجادات کے ہاتھوں تباہ ہو جائیگی اور خود اس کی کامیابی اس کی موت کا باعث بن جائے گی۔"

(Northrop, *Science and First Principles*, p. 2)

غرض ایک دوسرے مفکر کے لفظوں میں :۔

(Chester Rowell in *San Francisco Chronicle*, August 1930)

"ہم خود کو ایسے گرداب میں پھنسا پاتے ہیں جہاں کچھ بھی متعین نہیں ہے، یہاں تک کہ جو امواج ہمیں بہائے لیے جا رہی ہیں، ان کا رخ تک غیر متعین ہے۔"

ایک اور مفکر اس صورت حال سے پیدا شدہ تاثرات کو بدیں سطور قلمبند کرتا ہے:۔

"آج ہم اپنی نوعیت کے ایک عجیب دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں یہ صحیح معنوں میں ایک نازک دور ہے۔ ہم اپنی تہذیب و ثقافت کے ہر شعبہ میں مادی ہو یا روحانی، ایک نازک موڑ پر پہنچ چکے ہیں، اور یہ جذبہ نہ صرف ملکی معاملات کے احوال واقعی ہی میں کارفرما ہے بلکہ شخصی و اجتماعی زندگی کے اقدار اولیہ کے متعلق عام رجحانات میں بھی برابر ظاہر ہو رہا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ علامات ایک عظیم الشان نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہیں۔ لیکن کچھ اور لوگ بھی ہیں جنہیں ان ارتیابی رجحانات میں اس زوال کی خبر بدنظر آ رہی ہے جو ہماری تہذیب کے نصیب میں مقدر ہو چکا ہے۔"

(Max Plank, *Where is Science Going?*, p. 64)

نگاہِ بازگشت

یہ ہے میکانکیت یا "میکانکی توجیہ کائنات" سائنس کا سب سے بڑا شاہکار جو اسلام کے علاوہ عملاً تمام نظاموں کا اصل الاصول ہے۔ یہ اندازِ فکر معقولیت پسندی اور انسان دوستی کو مطمئن کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے، نیز عقل سلیم کے نزدیک اس کا کیا مرتبہ ہے، ان باتوں کا اندازہ محررہ بالا تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ آسان ہے کہ اگر فکر صالح اس سے مطمئن نہ ہو سکے تو اس کے متبادل انداز فکر کو اپنانے میں وہ کہاں تک حق بجانب ہے۔ یہ متبادل انداز فکر "کائناتی نصب العینیت" ہے۔

(ب) نصب العینی توجیہ کائنات

کائناتی نصب العینیت یا عالم کی مقصدی و نصب العینی توجیہ کی رُو سے دنیا کی تمام باتیں

انسانی اعمال ہوں یا مظاہر کائنات کسی نہ کسی مقصد و غرض کے ساتھ وابستہ ہیں۔ میکانکیت کے برعکس جس کی بنیاد "وجوب مطلق (Inexorable necessity)" پر قائم ہے، نصب العینی انداز فکر کا بنیادی تصوّر "ربوبیت" ہے جس کا فیصلہ ہے کہ عالم ایک حکیم و علیم، قادر و مرید اور رحمٰن و رحیم ہستی کی صنعت گری ہے۔ جس نے کائنات کو عبث و باطل پیدا نہیں کیا، بلکہ کسی بلند تر مقصد کے ساتھ خلق فرمایا ہے۔

سائنس اور نصب العینیت

سائنس خود میکانکیت کا دوسرا نام ہے۔ پھر بھی جہاں اسے میکانکیت کی ناکامی کا اعلان کرنا پڑا، نصب العینیت کی تائید بھی کرنا پڑی:۔

اولاً: نفسیات کا رجحان نصب العینیت ہی کی جانب ہے کیونکہ انسان فطری طور پر ہر چیز اور ہر واقعہ کو کسی نہ کسی مقصد و غایت سے وابستہ سمجھتا ہے اور اس میں بچے اور بوڑھے کی تخصیص نہیں ہے۔ بچہ بھی ہر چیز کے لئے پوچھتا ہے کہ یہ کاہے کے لیے ہے اور بڑا بھی ہر اس کام کی جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ عبث و باطل کے نام سے تحقیر کرتا ہے۔

ثانیاً: عقلائے روزگار کی بہت بڑی اکثریت ہمیشہ "نصب العینیت" (Purposiveness) کی علمبردار رہی ہے۔ عہد قدیم میں سقراط، افلاطون اور ارسطو، قرون وسطیٰ میں منٹ اگسٹائن اور ڈانٹے (مسلمان مفکرین کا تو یہی رجحان تھا) اور عہد حاضر میں برونو، نیوٹن، لیبنیز، والٹیر، گوتھے وغیرہم کائناتی مقصدیت و نصب العینیت ہی کے قائل تھے۔ اٹھارویں صدی میں پیلے (Paley) نام ایک فاضل نے اس قسم کی تمام شہادتوں کو ایک کتاب میں جمع کیا تھا جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کائنات میں یہ نظم و اتفاق ایک علیم و حکیم ہستی کی حکمت بالغہ کا نتیجہ ہے۔ عہد حاضر میں اس قسم کی ایک کتاب J. N. Shearman نے *The Natural Theology of Evolution* کے نام سے تصنیف کی ہے۔

ثالثاً: اس مسئلے کے لیے اکثر علمی مذاکرات (Symposium) بھی منعقد کرائے گئے ہیں، جن کے اندر مشاہیر سائنسدانوں نے کائنات کے اندر "مقصدیت" کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس قسم کے ایک مذاکرہ کے مقالات کو Frances Mason نے *The Great Design* کے نام سے جمع کر دیا ہے۔ اس مذاکرہ میں جن فضلائے سائنس نے حصہ لیا ہے، ان میں سے بعض مشاہیر کے نام یہ ہیں:۔

Robert Grant Aitkens, James Arnold Crowther,
G. Lloyd Morgan, Sir Oliver Lodge, Hans Driesch

ان فضلاء کا فیصلہ ہے کہ:۔

(۱) جب ہم کائنات کے نظم، اس کے کرات کی ترتیب و نظام اور قوانین فطرت کی ہمہ گیری پر غور کرتے ہیں تو ان میں عظیم الشان حکمت بالغہ اور احکام و اتقان نظر آتے ہیں۔

(۲) بحیثیت مجموعی عالم میں ایک صناع عظیم اور علیم و حکیم کی قدرت کاملہ کی شہادت ملتی ہے جو نظام کائنات کا مدبر بھی ہے۔

اسی قسم کا ایک دوسرا مجموعہ ایڈورڈ کاٹن کی زیر ادارت *Has Science Discovered God?* کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں مندرجہ ذیل سائنسدانوں نے خصوصیت سے حصہ لیا تھا:۔

Millikan, Mather Eddington, Conklin,
Einstein, Julian Huxley, McDougal, Pupin, Jeans

اس کے ایڈیٹر کا کہنا ہے:۔

'The conclusion of some of the best scientific minds civilization has produced, as stated in this discussion, proving that we are not living in a mechanical dispensation but in a universe of order and design responding perfectly to the nicety

of mathematical law and of beneficent purpose also, is not only one of the most important facts that confronts us—it is the most important .... It is sending men's minds rapidly forward to belief in the VISION SPLENDID.'

اگر علمی دنیا میں شخصیت کوئی اہمیت رکھتی ہے تو ایسے بلند دماغ سائنسدانوں کی رائے یقیناً درخور اعتنا سمجھی جانا چاہیئے۔

رابعاً: خالص سائنسی دنیا میں ہارورڈ یونیورسٹی کے حیاتی کیمیا کے پروفیسر ہنڈرسن نے اپنی تصانیف *The Fitness of Environment* اور *Order of Nature* میں ثابت کیا ہے کہ پیشتر اس کے کہ سطح زمین پر آثار حیات رونما ہوں، ماحول میں اس کے ظہور کے لئے ایک عجیب و غریب صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس "صلاحیت" کو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ ظہور حیات کے لئے ایک علیم و حکیم ہستی کی جانب سے فیضان استعداد تھا۔ اور اگر یہ نہ مانا جائے تو پھر اس صلاحیت کی توجیہ ناممکن ہو جاتی ہے۔ پروفیسر ہنڈرسن کے الفاظ یہ ہیں:-

'We are obliged to regard this collection of properties as in some intelligible sense a preparation for the processes of planetary evolution.... Therefore the properties of the elements must for the present be regarded as possessing a teleological character.'

خامساً: مقصدیت و غائیت کے متبادل حریفانہ نظام کی حیثیت سے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا گیا، مگر ڈارون کی توجیہ ہو یا لامارخ کی تعبیر جن مقدمات پر یہ نظریہ موقوف تھا، ان میں منطقی معیار پر پورا اترنے کی سکت نہ تھی۔ اس لیے بعد کی ارتقاء پسند طبائع نے اس کی "تطور فجائی" (Emergent Evolution) تخلیق ارتقاء Creative Evolution "جہد للحریت" (Struggle for Freedom) اور "عمل تحقق"

(Process of Realisation) وغیرہ عناوین کے نام سے تجدید کی۔ لیکن اگر نئے تصورات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی اساس کسی نہ کسی شکل میں "مقصدیت" (Purposiveness) کے بنیادی تصور پر قائم ہے۔

غرض مادہ پرستانہ نفسانیت کی خاطر "مقصدیت" کے اقرار سے کتراتے رہے۔ مگر معقولیت پسندی کے ساتھ نہ وہ اس کی تردید کر سکے اور نہ اس کی جگہ کوئی اطمینان بخش متبادل نظام پیش کر سکے۔

"نصب العینیت" خود فطرت انسانی کا تقاضا ہے اور فطرت کے تقاضے کسی کے مٹائے مٹا نہیں کرتے۔

نصب العینیت اور فعال زندگی کی ہمت افزائی

نصب العینی اندازِ فکر کا مرکزی تصور ایک بلند تر مقصد حیات کا تحقق ہے۔ اس بلند تر مقصد حیات کے حصول کی تڑپ انسان کو ذوقِ عمل کے جذبے سے سرشار کر دیتی ہے وہ پانی کا بلبلہ نہیں کہ ہوا کے تموّج سے پیدا ہوا اور ناپید ہو گیا، وہ تنکا نہیں جو ہوا کے جھونکوں کے رحم و کرم پہ پڑا ہو، وہ فطرت کی نام نہاد قوتوں کے عمل و تعامل کا تختۂ مشق نہیں بلکہ کائنات اور اس کی پوشیدہ قوتیں اس کی خادم ہیں۔ جنہیں خلاّق کائنات نے مسخر کر کے اس کے قابو میں دے دیا ہے تاکہ وہ اپنی معاش و معاد کی صلاح و فلاح کا باحسن وجوہ انتظام کر کے اپنے منشائے تخلیق کو پالے، اور اپنے مقصدِ حیات کو حاصل کر کے فوزانِ ابدی سے ہمکنار ہو:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

نصب العینیت اور معاشرتی تنظیم

ظاہر ہے اس ذہنی رجحان سے متصف ہو کر جو معاشرہ بنے گا، اس کی ہیئت اور مزاج میکانکی اندازِ فکر کے ماتحت بننے والے معاشرے کی ہیئت و مزاج سے بنیادی طور پر مختلف

ہونگے - اور دونوں کی تنظیم میں جو قوانین کارفرما ہیں، اُن میں اصولی فرق ہوگا :-

ا - رہبانیت تو علی الاعلان معاشرتی زندگی اور اجتماعی تنظیم کی منکر ہے۔

ب - لیکن دنیا طلب معاشرہ بھی انتشار ذرا اور فارق المرکز قوتوں کے اثر سے خالی نہیں، کیونکہ افراد کی "انانیت" آگے چل کر "طبقاتی کشمکش کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ چنگاری کچھ دن تو ظاہری نظم و ضبط کے تلے دبی رہتی ہے، مگر جونہی موقع ملتا ہے بھڑک کر پورے معاشرہ کو اپنے شعلوں کی لپیٹ میں لے کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔

مگر "نصب العینیت" اصولاً ایک منظم معاشرے کی مقتضی ہے۔ وہ انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی پر زور دیتی ہے تاکہ آپس کے تعاون و اشتراکِ عمل سے حصول معاش اور تحفظ ذات کے کام کو کم سے کم توانائی اور وقت صرف کر کے پورا کریں اور بقیہ توانائی اور وقت اس بلند نصب العین کے تحقق میں صرف کریں جو نہ صرف تخلیق انسانی ہی کی غایت ہے، بلکہ آفرینش کائنات کا بھی مقصد ہے۔

نصب العینیت اور طبقاتی کشمکش کا فقدان

لیکن جو چیز نصب العینی انداز فکر کے ماتحت منظم ہونے والے معاشرہ کو میکانکی اندازِ فکر کے تحت تشکیل پانے والے معاشرے سے ممتاز کرتی ہے وہ اول الذکر میں "طبقاتی کشمکش" کا فقدان ہے۔ اشتراک مقصد (Community of Interest) کا احساس اپنے دیگر بنی نوع کے متعلق معاندانہ رجحانات کے بجائے افراد میں "جذبۂ رفاقت اور (Fellow-feeling) اور "اخوانی میلانات (Altruistic tendencies) پیدا کر دیتا ہے اور یہی اُمور معاشرے کے استحکام اور پائیداری کے ضامن و کفیل ہیں۔ اس طرح طبقاتی کشمکش کا فقدان اور جذبہ رفاقت و احساس اخوت اس معاشرے کے منظم کرنے والے قوانین کو اپنے مخصوص رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔

اور اس طرح نصب العینی اندازِ فکر کی اشاعت فطری طور پر ایک صالح معاشرے کے قیام

وبقاء کی متکفل ہو جاتی ہے جو دنیوی سعادات کا منتہا اور سعادت اخروی کی شرطِ اوّلین ہے۔

نصب العینیت اور بلند نظری

ایک متعین مقصد حیات اور ایک بلند تر نصب العین کا تصور زندگی کو ایک سنجیدہ حقیقت بنا دیتے ہیں۔ زندگی عمر طبعی کا نام نہیں رہتی، بلکہ اس کا استداد خلود و ابد کے ساتھ منطبق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا نظر میں بلندی اور ظرف میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا طلبی منتہائے نظر نہیں رہتی۔ اس کے ساتھ ساتھ دنات نفس اور کم ظرفی جو تنگ نظر دنیا طلبی کے لوازم ہیں، خود بخود طبیعت سے دُور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ دنیا طلبی کے بجائے عقبیٰ طلبی میں زندگی کی قدر اعلیٰ قرار پاتی ہے۔ اب دنیا مقصود بالذات ہونے کے بجائے محض وسیلہ رہ جاتی ہے۔ طاقت و قوت کے بجائے اتقاء اور پرہیز گاری زندگی کی سب سے بڑی سعادت بن جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں افراد کے اندر ملکوتیت اور فرشتہ سیرتی پیدا ہو جاتی ہے۔

نصب العینیت اور حریتِ عمل

چونکہ نصب العینی انداز فکر کے ماتحت جو نظام عمل مرتب ہوتا ہے، اس کے رگ و ریشہ میں مقصدیت و نصب العینیت (Purposiveness) کا تصور جاری و ساری رہتا ہے اور چونکہ "وجوب مطلق" اور "ضرورت عمیا (Blind necessity) کے برخلاف مقصدیت ایک ایسے ماحول کی مقتضی ہے، جہاں ہم آہنگی و بے آہنگی اور توافق و تضاد دونوں ہی کا امکان ہو، اس لئے حریتِ عمل نصب العینی انداز فکر کا بنیادی اور اساسی تصور ہے جو انسان کو اس کی خودی و خود داری کا احساس سکھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ کائنات کے اندر اس کی بھی کوئی اہمیت ہے، اس کے وجود میں آنے کا بھی کوئی مقصد ہے اور اس کی ہستی ارض و سما کی وسعت کے مقابلے میں کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو اور اس کی زندگی دنیا کی عمر کے مقابلے میں کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، بایں ہمہ اُسے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔

نصب العینیت اور جوشِ نشاط

یہ "کچھ نہ کچھ کرنے کا احساس"۔ "مقصد زندگی کے تحقق کا تخیل" اور ایک بلند تر نصب العین کے حصول کی تڑپ"، خود انسان کی زندگی کو ذوقِ عمل کے جذبے سے سرشار کر دیتے ہیں۔ اس طرح انسان اپنے میں ایک حریت عمل، ایک گرم جوشی، ایک خود اعتمادی اور ایک طرح کا سرور محسوس کرتا ہے، اور ان چیزوں کے ہوتے ہوئے زندگی ایک "ناگزیر مصیبت" نہیں رہتی بلکہ ایک "ایجابی نعمت" بن جاتی ہے:

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
وز شعاعِ آرزو تابندہ ایم

تاریخِ تصوّف

قبل از اسلام

مصنف:۔ بشیر احمد ڈار

اسلام سے پہلے تصوّف کے سلسلہ میں جو افکار پیش کیے گئے ہیں ان کا اس کتاب میں تنقیدی اور تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور آرفیس، فیثاغورث، عرفانی حکماء، فلاطینوس عہد عتیق کے نوشتے، فیلو، مزدی اسرار، ہرمیس عہدِ جدید کے نوشتے، پولوس، آگسٹائن اور ملاوزی کے افکار و نظریات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت:۔ ۲۵ر۴ روپے

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ، لاہور (پاکستان)